

سر کا کر شان سے کہا۔ اسے یاد آیا کہ یہ تینوں سیاح بھی کمپنگ کے دفتر میں جگہ کی تلاش میں آئے تھے اور اب وہاں سے ماہیوس واپس لوٹ رہے تھے۔

”بہت بہت شکریہ“ سنان نے فوراً دعوت قبول کر لی اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

”تم شر میں کس جگہ اتنا پسند کرو گے؟“ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھے لڑکے نے

دریافت کیا۔

”مجھے ہتھیا گیا ہے کہ موہارت کے علاقے میں شاید رہائش کا بندوبست ہو سکے“

”ٹھیک ہے۔“ اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی نے سر ہلایا۔ ”ہم اس کمپنگ گراونڈز میں آنے سے پہلے دو اور کمپنگ گراونڈز میں بھی ہو آئے ہیں۔ وہاں بھی جگہ نہ

تھی پورا پیرس سیاحوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم تینوں نے تو فیصلہ کیا ہے کہ پیرس کی  
بجائے نزدیکی شردار سیلز میں رات بُر کر لیں۔“

”تم اگر چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔“ اگلی نشست پر بیٹھی لڑکی نے مرکر

کہا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناج رہی تھی۔ ”موہارت کا علاقہ قدرے خطرناک  
ہے۔“

پہلے تو سنان کا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے ساتھ وار سیلز ہی چلا  
جائے مگر ساتھ ہی اسے پاسکل کے کے ہوئے الفاظ یاد آگئے۔ ”لوگ پہلے پہل میرے  
حیثیں چرے کو دیکھ کر مجھ سے ملنے کی خواہش کا انعام کر بیٹھتے ہیں اور بعد میں  
جب۔۔۔“

”شکریہ۔۔۔ لیکن مجھے پیرس میں اخذ ضروری کام ہیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ لڑکی نے کندھے سکریٹر کر کما اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ  
گئی۔

انہوں نے اسے موہارت کا علاقہ شروع ہوتے ہی ایک چوک میں اتار دیا۔ پیرس  
کا یہ حصہ تلک و تاریک گلیوں اور قدیم مکانوں پر مشتمل تھا۔ جگہ جگہ غلامات کے  
ڈھیر پڑے تھے۔ تمام گلیاں پتھر کے بڑے بڑے گلکوں سے بنی تھیں اور اکثر مکان بے

حدائقتہ حالت میں تھے۔ نان کافی دیر ان گلیوں میں گھومتا رہا مگر اسے کہیں بھی کسی ہوش کا بورڈ نظر نہ آیا۔ ایک چھوٹے سے قوہ خانہ کے باہر فٹ پاتھ پر گئی ہوئی کرسیوں پر چند بوڑھے فرانسیسی اور غیر ملکی مصور سرخ شراب پینے میں مشغول تھے۔ قوہ خانے کا نام ”پگال“ تھا۔ نان اندر چلا گیا۔ قوہ خانے کا مالک ایک سفید جھاڑن سے کاؤٹر کی سطح صاف کر رہا تھا۔ نان نے اپنا سامان ایک کونے میں رکھا اور کاؤٹر کے سامنے ایک کری پیٹھ کر اسے کافی بانے کے لیے کہا۔ مالک نے کافی مشین کا ہینڈل گھمایا اور گرم گرم کافی کی پیالی نان کے آگے رکھ دی۔ نان نے پیالی اٹھائی پھوٹک مار کر کافی کی اوپر آئی ہوئی گاڑھی جھاگ ایک طرف کی اور پھر کافی کی ایک چکلی لگا کر پیالی کاؤٹر پر رکھ دی۔

”موسیو۔“ نان نے اشاروں سے اپنا مدعای بیان کرنے کی کوشش کی۔ ”ہوش نونے کے لیے؟“

مالک نے جھاڑن کندھے پر رکھا اور ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا۔ ”نو انگلیس“ یعنی مجھے انگریزی نہیں آتی جانے کیا کہہ رہے ہو۔

”نو ان گلیس“ نان نے چڑ کر اس کی نقل اتاری اور پھر چپکے سے کافی پینے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے سوچا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ اگر رہائش کے لیے کوئی جگہ نہ ملتے تو وہ سامان سمیت ہی پاسکل سے ملتے چلا جائے اور پھر رات سین کے کسی خوبصورت پل تلے بر کر کے دوسری صبح پھر تلاش شروع کی جائے۔ وہ انہی سوچوں میں غلطال تھا کہ اس کے کندھے پر کسی نے آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔

”ہیلو!“ ایک لرزتی ہوئی آواز آئی۔

وہ پیچھے مردا تو اس کے سامنے سیاہ لباس میں لمبوس ایک ضعیف عورت کھڑی تھی۔

”ہوش موسیو؟“ بدھیا نے اپنا بگلا سر ہلا کر دریافت کیا۔

وہ شاید کہیں آس پاس ہی بیٹھی اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ بدھیا کے ہاتھ میں

ایک آہنی پنجوں لٹک رہا تھا جس میں بند ایک گنجبا سا بد صورت طوطا سنان سے نظر  
ملاتے ہی نہیں تھیں کرنے لگا۔ بڑھیا نے پنجوں فرش پر رکھا اور اسے کھول کر طوطے کے  
ستجے سر پر ایک چپت لگائی۔ طوطا فورا خاموش ہو گیا اس کام سے قادر ہو کر بڑھیا پر  
سنان سے مخاطب ہوئی۔

”ہوتی موسیو؟“

”ہاں بالکل ہوتی بڑی اماں۔“ سنان نے خوش ہو کر کہا اور پھر طوطے کی طرف  
دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں۔ طوطا پھر نہیں تھیں کرنے لگا۔ بڑھیا نے قرآن کو نظروں سے  
سنان کی جانب دیکھا اور ایک مرتبہ پھر چپت لگانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس نے پنجوں  
اٹھا کر سنان کو سر کے اشارے سے پیچھے آنے کو کہا اور توہ خانے سے باہر نکل گئی۔  
سنان نے جلدی سے کافی کی قیمت ادا کی اور اپنا سامان اٹھا کر بڑھیا کے پیچھے چل دیا۔

بڑھیا بے حد آہستہ آہستہ ہاتھ میں پنجوں لٹکائے اس کے آگے آگے چلی جا رہی  
تھی۔ ایک دکان کے باہر اس نے سنان کو دیہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کیا۔ اندر جا کر  
ڈبل روٹی اور مکھن وغیرہ خریدا اور باہر آ کر پھر اسی ست رفتاری سے سنان کے آگے  
آگے چلنے لگی۔ سنان کو اب بے حد کوافت ہو رہی تھی کہ یہ سفید بالوں والی ماٹی جانے  
اسے کسی ہوٹل کی طرف لے جا رہی ہے یا یوں ہی پرس کے گلی کوچوں کی سیر کروا  
رہی ہے۔

”بڑی اماں ہوٹل ہے بھی یا نہیں۔“ ننگ آ کر سنان نے بڑھیا سے پوچھا۔

”ہوتی۔ ہوتی۔“ بڑھیا نے اپنا بگلا سر پھر بھالیا اور اسی ست روی سے آگے  
آگے چلنے لگی۔ ایک دو مرتبہ سنان نے جان بوجھ کر طوطے کو اپنی بڑی بڑی آنکھیں  
دکھائیں اور وہ حسب معمول نہیں پر اتر آیا۔ بڑھیا نے بڑے اطمینان سے اپنی  
پرانی ترکیب آزمائی اور طوطا پھر خاموش ہو گیا۔

ایک جگہ پھر کی کمی بڑھیاں اتر کر وہ ایک ننگ گلی میں مڑ گئے۔ بڑھیا ایک  
نہایت بو سیدہ مکان کے سامنے جا کر رک گئی جو کسی صورت بھی ہوٹل معلوم نہ ہوتا

تھا۔ جگہ جگہ پلاسٹر اکٹا ہوا تھا اور دیواروں کا رنگ ماند پڑا تھا۔  
”ہوتی۔“ بڑھیا نے اسے اندر آئے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی اپنا پولہ منہ کھول

سکراڈی۔

بڑھیا نے آگے بڑھ کر مکان کا دروازہ کھولا تو اس کے ساتھ بندھی ہوئی گھنٹی دو مرتبہ شن شن بجی۔ سنان نے اپنا سامان فرش پر رکھ دیا اور مکان کا جائزہ لیا۔ یہ ایک نہایت ہی پرانی وضع کی عمارت تھی۔ اندر آئے والے دروازے کے سامنے سے ہی اوپر والی منزل تک لکڑی کی سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ فرش پر ایک پھٹا ہوا عالیچہ پڑا تھا جس پر نقش تمام پھولوں کا رنگ اب زرد پڑا تھا۔ پورا مکان بالکل غیر آباد لگتا تھا۔ کیدم دائیں ہاتھ کے کرے کا دروازہ کھلا اور درمیانی عمر کی ایک خوش شکل عورت کر کے گرد اپرن باندھے باہر نکلی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے لیکن ہونٹوں پر جی لپ سنک بالکل تازہ تھی۔ اس نے بڑھیا سے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا اور پھر اس نے سنان کی جانب دیکھا۔

”ہوتی۔“ بڑھیا نے اس عورت سے سرہلا کر کہا اور پھر سنان کی طرف اشارہ کیا۔

”آہا۔ ہوتی۔“ عورت نے سکرا کر اپنا میلا کچیلا ہاتھ سنان کے آگے کر دیا۔ سنان نے ہاتھ چھو کر چھوڑ دیا۔ بے حد گرم تھا۔ شاید باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔

”کیا آپ انگریزی بول سکتی ہیں؟“

”تمہاری تمہاری“ عورت نے نہ کر جواب دیا۔

”تو پھر مجھے رہائش کے لیے ایک کرہ چاہیے۔ ابھی۔“

عورت نے بڑھیا کے کان میں کچھ کمر پسکی اور پھر بڑی دل نواز سکراہٹ کے ساتھ سنان کی طرف دیکھا۔

”میں فرائک ہوں گے۔“

”بیس فرائنک؟ بہت زیادہ ہیں۔“ سان نے یونہی کہہ دیا حالانکہ وہ آج کی شب گزارنے کے لیے اس سے دمغی رقم بھی ادا کرنے کو تیار تھا۔

”بیس فرائنک ایک ہفتے کے لیے زیادہ ہیں؟“ عورت نے حیرت سے پوچھا۔ ”ایک ہفتے کے لیے؟“ سان نے خوش ہو کر کہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کرایہ ایک دن کا تھا۔ ”بہت خوب۔ ہیں تو زیادہ بہرحال مجھے کرایہ منکور ہے“ اس نے اپنا سامان اٹھا لیا۔

”کون سا کمرہ؟“

”دس فرائنک پیش گئی۔“ عورت نے کاروباری انداز میں کما اور دونوں ہاتھ کو ہلوں پر رکھ کر سان کو سمجھنے لگی۔ اس نے فوراً مطلوبہ رقم ادا کر دی۔

برھیا نے جو اس عورت کی ماں تھی طوطے کا پنجوہ ہال کے ایک کونے میں رکھا اور ایک بڑا سا برش اٹھا کر بیڑھیاں صاف کرنے لگی۔

عورت نے دس فرائنک اپنے بلاوز میں اڑس لیے اور سان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بیڑھیوں پر گرد کی تھیں جبی تھیں اور ویسے بھی محدود شالت میں تھیں۔ سان نہایت احتیاط سے قدم رکھتا اس کے پیچھے ہو لیا۔ تیسری منزل پر عورت ایک کالے رنگ کے بڑے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور دروازہ ٹھکٹھایا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

”کم بخت اندر ہی ہے۔ جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہا۔“ عورت نے مزکر سان کو کہا۔ سان اس معنے کو حل نہ کر سکا کہ اندر کون کم بخت ہے اور کیوں جواب نہیں دے رہا۔

تھوڑی دیر بعد عورت نے دروازہ خوب نور زور سے پیٹا۔ خاصی دیر بعد دروازہ ذرا سا کھلا اور اس کے پیچھے ایک آنکھ دکھائی دی۔ عورت نے ایک دم کواڑ کو دھکیل کر پورا دروازہ کھول دیا۔ ان کے سامنے صرف ایک نیکر میں ملبوس ایک لمبا ترزا جیت زدہ نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بھی داڑھی اس کے چوڑے سینے پر جنگلی گھاس کی

مروح بکھری پڑی تھی۔ سچ کمرے میں تصویرِ کشی کے تمام لوازمات بکھرے پڑے تھے۔  
رنگوں کے ڈبے، خالی کینوس، بُرش، مٹی کے تیل کی بوتلیں وغیرہ۔  
”پال ابھی اور اسی وقت میرا کمرہ خالی کرو۔ نیا کرایہ دار آگیا ہے۔“  
”لیکن میڈم ٹھی ابھی تک میری بیوی لوئیں قبوہ خانے میں کام ختم کر کے  
وپس بھی نہیں لوئی۔“

”تمہاری بیوی؟“ میڈم ٹھی نے مصنوعی حیرت سے منہ پر ہتھیلی رکھتے ہوئے کہا  
اور پھر سنان سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”ہر مینے بدلتا ہے۔ بیوی وغیرہ کوئی نہیں۔  
واشٹہ ہے۔“

”میں معاشرے کے گھے پڑے اقتدار پر یقین نہیں رکھتا۔ لوئیں اور میں ذہنی طور  
پر ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ جسمانی قوت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔“  
نیکر میں لمبسوں مصور پال نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”اور شاید انہی گھے پڑے اقتدار پر بے یقینی کی وجہ سے تم نے پچھلے تین ماہ سے  
کمرے کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ ہوں؟“ میڈم ٹھی کرگی۔  
”لوئیں کو اس بہتے تنخواہ ملے گی تو ضرور ادا کر دوں گا۔“ پال نے وہیں کمرے  
کمرے اتنا گا۔

”ضرور ادا کر دوں گا۔“ میڈم ٹھی نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری اور  
دوبارہ سنان سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”عورت کی کمالی کھاتا ہے کم بخت“ اور پھر  
ایک دم چینی ”ابھی۔ اور اسی وقت۔ کمرہ خالی کر دو ورنہ میں پولیس کو اطلاع کر  
دوں گی۔“

سنان اس ناخوشگوار صورت حال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر  
میڈم ٹھی سے کہا۔

”عمرانی کر کے آپ اس مصور کو کمرے سے باہر نکالنے کی زحمت گوارانہ کریں  
میں رہائش کے لیے کوئی اور جگہ ڈھونڈ لیتا ہوں۔“

”تم نے جو دس فرماں کیا کیے ہیں۔ وہ واپس نہیں دوں گی۔“

سان نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور بغیر کچھ کے میرجیوں سے پیچے اترنے لگا۔  
”اے مرد!“

سان نے پیچے مڑ کر دیکھا تو مصور بعد اپنی اکتوتی نیکر اس کے پیچے پیچے چلا  
رہا تھا۔

”آپ خواہ نخواہ اپنے دس فرماں ضائع نہ کریں۔ میں ہی چلا جاتا ہوں۔ یہ  
ٹیکل کی پچی دیے بھی مجھے باہر نکالنے پر تی ہوئی ہے۔“

سان کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔

”لیکن تم آج شب جاؤ گے کہاں؟“

”اپنی پچھلی بیوی۔ آہم میرا مطلب ہے دوست لڑکی کے ہاں جا کر سورہوں  
گھا۔“

”اور جو محترمہ قوہ خانے میں کام کر کے واپس نہیں لوٹیں ان کا کیا ہو گا؟“

”اس کو تم رکھ لیتا۔“

”رکھ۔ آہم۔“ سان کا سانس وہیں رک گیا۔ ”لیکن۔“

”ہاں ہاں کیا قباحت ہے۔ لوئیں نہایت خوش شکل لڑکی ہے۔“

”وہ تو نجیک ہے مگر۔“

”مگر کیا؟“

”میں تو۔۔۔ شادی شدہ ہوں۔“ سان نے جان چھڑانے کی غرض سے یونی کہ

دیا۔

”اس سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ سا ہے اور مشرق میں عام آدمیوں کے ہاں بھی  
درجن بھر تو ضرور ہوتی ہیں۔“

”کیا ہوتی ہیں درجن بھر؟“ سان نے جیران ہو کر پوچھا۔

”بیویاں اور کیا۔“ پال نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

ننان ہنئے لگا۔ ”نہیں دوست ایسا میرے لیے کم از کم ناممکن ہے۔ بھر حال پیش  
محل کا شکریہ۔“

”غیرے۔“ مصور نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی اپنا سامان اٹھا لیتا ہوں اور  
وہیں کو جا کر اطلاع کر دوں گا کہ آج کے بعد چھٹی۔“  
میڈم ٹھی اس دوران میں کمرے کے دروازے کے ساتھ نیک لگائے ان دونوں  
کی گنتیگو بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

ننان اور پال دونوں اوپر کمرے میں آگئے اور مصور نے اپنا منحصر اٹاٹہ ایک  
بوری میں بند کر کے کندھے پر اٹھایا۔

”اچھا دوست اب پھر ملاقات ہو گی۔“ اس نے مسکرا کر ننان سے کہا۔  
”کہاں؟“ ننان نے دریافت کیا۔ وہ اس مصور کی انفرادیت پسندی سے بے حد  
متاثر ہوا تھا۔

”یہیں موہارت کے کسی قوہ خانے میں۔“ یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔  
صرف نیک میں ملبوس کندھے پر بوری اٹھائے ہوئے یہ باریش مصور اسے بے حد اچھا  
لگا۔

”اڑے اوپال کے بچے۔“ میڈم ٹھی نے سیڑھی کا ڈندا کپڑا کر زور سے اسے  
آواز دی۔ ”اور وہ تین ماہ کا کرایہ۔“

پال نے ہال میں جا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر آنکھ میچ کر مسکرا دیا۔  
”بدمعاش کمیں کا۔“ میڈم ٹھی کے لیوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کمرے کے  
کونے میں ایک پرانا آہنی پینگ پڑا تھا۔ پھٹے ہوئے گدے میں سے لٹکتے ہوئے متعدد  
پر گنگ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ پینگ یا تو اپنی لمبی عمر پوری کر چکا ہے اور  
یا پھر اس کے ساتھ کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کھنڑا قسم کی الماری  
تمی جس کا ایک کواڑ غائب تھا اور اندر بیڑا اور وائن کی خالی بوتلیں اونڈھی پڑی  
چھیں۔ کمرے میں پانی کا ٹیل اور ایک ٹوٹا ہوا منہ ہاتھ دھونے کا چینی کا بنا ہوا برتن

بھی تھا۔ سنان نے ٹل کی ٹونٹی سمجھائی تو سوائے شوں شوں کی آواز کے اور کچھ برآمدہ ہوا۔

”یہ پال کا پچھہ عسل خانے میں جانے کی بجائے یہیں کرے میں نہالیا کرتا تھا اس لئے میں نے نیچے سے پانی ہی بند کر دیا تھا۔ ابھی کھولے دیتی ہوں“

میڈم ڈی نے معدودت بھرے لبجے میں کما۔

کمرے کی ایک ہی کھڑکی تھی جو گلی جانب کھلتی تھی۔ گلی کے اس پار موارت کا قدیم علاقہ نہایت دل کش لگ رہا تھا۔ پرانی طرز کے تک مکان جن کی بالکل نہیں پر مکینوں نے پھولوں کے گلے سجار کھے تھے۔ ان سب سے پرے سیکرے کر کے مشہور کلیسا کے خوبصورت مشقی طرز کے گنبد ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعوں میں چمک رہے تھے۔

سنان کھڑکی سے مڑا تو میڈم ڈی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

”بڑا اچھا کرو ہے۔“ سنان چلتا ہوا دروازے تک آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میڈم ڈی اب یہاں سے چلی جائے تاکہ وہ جلدی سے تیار ہو کر پاسکل کو ملنے چلا جائے۔

”بہت بہت شکریہ“

میڈم نے ایک اچھتی سی نگاہ سنان پر ڈالی اور پھر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

”اور ہاں“ اس نے میری ہیوں کے پاس جا کر کما۔ ”رکھ لیتے۔ لڑکی بربی نہیں۔“

”کون سی لڑکی؟“ سنان نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”وہی لوئیس۔۔۔ پال کی داشت۔۔۔“

سنان نے جواب دینا مناسب نہ جانا اور ہنس کر دروازہ بند کر لیا۔

اس نے گھری پر وقت دیکھا تو سات بجئے کوئی تھے اور اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ شر کے اس حصے سے آئیں تھا اور تک کا فاصلہ کتنا ہے اور وہاں پہنچنے کے لیے کتنا وقت درکار ہے۔ بھر حال منہ ہاتھ دھونے کا تردود کیے بغیر اس نے جلدی سے کپڑے بدے

اور اپنا کمرہ تقلیل کر کے سیر ہمیوں پر آگیا۔  
”ہیلو۔“

سنان ٹھنک گیا۔

اس کے ساتھ والے کمرے کے دروازے کا کواڑ زرا سا کھلا تھا اور ایک کالے پاؤں اور کالی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی بیچ میں سے جھانک رہی تھی۔  
”ہیلو۔“ سنان نے بیوں پر چمکی سی مسکراہٹ لا کر جواب دیا اور جلدی سے بیچے اتر گیا۔ جانے کون تھی۔

بیچے ہال میں آیا تو میڈم ڈی کوئے میں رکھے ایک پرانے صوفے پر بیٹھی سکرت کے کش لگا رہی تھی۔ اس کے سامنے تپائی پر ایک بوتل اور سرخ شراب سے بھرا ہوا گلاس دھرا تھا۔ یہ شاید سنان کے پیشگی کرائے کا کرشمہ تھا۔

”میڈم ڈی! کیا آپ مجھے ہتا سکیں گی کہ آنفل ناور جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے؟“

”تمہیں نہ بتاؤں گی تو اور کس کو بتاؤں گی۔“ میڈم ڈی نے جس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے ایک دلواز مسکراہٹ اپنے بیوں پر سجا کر کہا۔  
سان اس وقت اس قسم کی بے مقصد باتیں سننے کے موڑ میں نہ تھا۔ وہ باہر نکلنے کا تو میڈم ڈی ہنسنے لگی۔

”کہا را گئے؟ دائیں ہاتھ پر چوک، میں ”میزو“ یعنی زیر زمین رلوے کا سیشیں ہے۔  
وہاں سے آنفل ناور کے لیے گاڑی مل جائے گی۔“

”مشکریہ“ سنان نے قدرے جھک کر کہا۔ ”اور ہاں“ اسے ایک دم خیال آگیا۔  
”میرے ساتھ والے کمرے میں کون رہتا ہے؟“

”چلواسے ہی رکھ لو۔“ میڈم ڈی نے لمرا کر کہا۔  
”کے؟“ سنان نے جھلا کر پوچھا۔

”اسی فرائغوالیں لڑکی کو جو تمہارے ساتھ والے کمرے میں رہتی ہے۔“

سنان بیڑا آتا ہوا مکان سے باہر آگیا۔  
واقعی مومارت بے حد "خطرناک" علاقہ تھا۔

○○○

نان میڈم ٹھی کے چتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا چوک تک آگیا۔ "سینٹرو" کے بوڑھے پہلو میں اترنی ہوئی سیر ہیاں ملے کر کے وہ ایک طویل زمنی راستے کے دروازے پر آگیا جس کے آخر میں شیشناں کا پلیٹ فارم تھا۔ نان تیزی سے چلتا ہوا جب اس زمنی راستے کے آخر میں داخلے کے دروازے پر پہنچا تو وہاں کھڑے چیکر نے اس سے ٹکٹ ٹلب کیا۔

"ٹکٹ پلیٹ فارم پر نہیں ملتے کیا؟" نان نے پریشان ہو کر چیکر سے پوچھا۔  
"نہیں" چیکر جو دوسرے مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے میں بہت مصروف تھا جلدی سے کہنے لگا "اس زمنی راستے کے شروع میں جماں سے تم آئے ہو ٹکٹ کی خود کار مشینیں نصب ہیں۔"

نان نے پیچھے مرکر فرلانگ بھر لبے راستے کو ایک نظر دیکھا اور پھر چیکر سے کہنے لگا۔

"آپ ٹکٹ کی رقم مجھ سے بیس سے لیں اور کسی طرح ایک ٹکٹ عنایت کر دیجئے مجھے کہیں جلدی میں پہنچنا ہے۔"

"اُن سب لوگوں نے بھی کہیں نہ کہیں جلدی میں پہنچنا ہے۔ ٹکٹ صرف راستے کے شروع میں نصب شدہ مشینوں پر ہی مل سکتے ہیں۔" چیکر نے رکھائی سے کما اور دوسرے مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے لگا۔

نان اس چیکر اور فرانسیسی ربلوے سسٹم کو کوستا اور بھاگتا ہوا واپس پہنچا مشین میں سکھ ڈال کر ٹکٹ حاصل کیا اور پھر ہانپتا ہوا، واپس آیا۔ اس بھاگ دوڑ میں پندرہ

مٹ ضائع ہو گئے۔ اسی وقت پلیٹ فارم پر ایک گاڑی داخل ہوئی تو سنان اس میں فوراً سوار ہو گیا۔ گاڑی حرکت میں آئی تو ساتھ والے مسافر سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گاڑی آنکل ٹاور کے بالکل مختلف سمت میں جا رہی ہے۔ سنان بے چینی اور لامبارگی کے عالم میں اپنے ہونٹ کا نتا اگلے شیش پر اتر گیا۔ عجلت کی وجہ سے وہ بوکھلا سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون سے پلیٹ فارم پر جائے اور کس گاڑی پر سوار ہو۔ زبان کی ناداقیت کی بنا پر وہ کسی سے اپنا معاجمی بیان نہ کر سکتا تھا۔ بالآخر ڈیوٹی سے فارغ ایک کنڈکٹر نے اس کی مشکل حل کی۔ اور درست سمت جاتی ہوئی ایک گاڑی پر سوار کر دیا۔ کنڈکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے کنکورو کے شیش سے گاڑی بدلتی اور پھر آنکل ٹاور کے شیش پر اتر گیا۔

سنان شیش سے باہر آیا تو آٹھ بجے رہے تھے۔ دریائے میں کے کنارے مشہور زمانہ آنکل ٹاور ایک جناتی پرندے کی مانند زمین میں اپنے آہنی پنجے گاڑھے آسمان کی وسعتوں کو چھو رہا تھا۔ ٹاور کے خول کے نیچے سیاحوں کے ٹھٹھے لگے تھے۔ فوٹو گرافر آئیں کہم پیچے والے، تصویری پوسٹ کارڈوں اور سوونیز کے کھوکھے قبوہ خانے غرض کے خوب رونق تھی۔

سنان کو یہ دیکھ کر بیجد حیرت ہوئی کہ آنکل ٹاور جو دور سے ایک عام مینار نظر آتا تھا جنم میں اتنا بڑا تھا کہ اس کے چار پاپیوں تلنے ہزاروں افراد بخوبی ساکھتے تھے اور ان میں ایک دھان پان سی لڑکی کی تلاش خاصہ دشوار امر تھا۔ سنان سیاحوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا ہر ایک کو یاس و امید کی نظرلوں سے دیکھتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ پاسکل وہاں نہیں تھی۔ اسے اس بات کا مکمل یقین تھا کہ وہ ضرور پورے سات بجے وہاں پہنچی ہو گی۔ اور اسے وہاں نہ پا کر مایوس لوٹ گئی ہو گی۔ وہ ضرور یہی سمجھتی ہو گی کہ سنان کی دلچسپی اور لوگوں کی طرح وقتن طور پر تھی اور بعد میں صورت حال کا احساس کرتے ہوئے اس نے اسے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس خیال نے اسے بیجد غمگین کر دیا۔ اسے اب ہیرس اور اس کی پرفسوں شام سے بالکل دلچسپی نہ رہی تھی۔

وہ ناور کے سامنے والے پل پر کھڑا رہا۔ اس موهوم امید میں کہ شاید پاسکل کو ہی وہاں پہنچنے میں تاثیر ہو گئی ہو مگر رات گئے تک پاسکل نہ آئی۔ وہ یقیناً سات بجے ہی آئی ہو گی سنان نے اس ہو کر سوچا بلکہ پونے سات بجے جیسا کہ اس نے ہنس کر وعدہ کیا

تفہ

بارہ بجے کے قریب جب آنکل ناول اور اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے وسیع پانچ سیاحوں سے خالی ہونا شروع ہو گئے اور دریائے سین کے کنارے اکا دکا جوڑوں کے علاوہ کوئی باقی نہ رہا تو وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس شیش پر آگیا اور وہاں سے گاڑی پر سوار ہو کر مومارت میں اپنے مکان پر آگیا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کپڑے اتارے۔ سامان میں سے اپنی سفری رضائی نکال کر پلنگ پر بچھائی اور اس میں گھس کر پچھے سے لیٹ گیا۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی، پہلے اس نے سوچا کہ کیوں نہ کل صبح ہی پہلی گاڑی سے ہسپانیہ روانہ ہو جائے اگرچہ وہ پیرس میں پہلی مرتبہ آیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ جتنے روز بھی یہاں رہے گا پاسکل کی یاد اس کے ذہن پر سوار رہے گی اور وہ پیرس جیسے حسین شر میں بھی خوش نہ رہ سکے گا۔ پھر ایک موهوم سی امید نے جنم لیا، ہو سکتا ہے کہ اس شہر کے گلی کوچوں میں کسی روز پاسکل اسے راہ چلتے ہی مل جائے۔ وہ کہتی تھی کہ میں ہر شام دریائے سین کے کنارے اکیلی گھونٹنے جاتی ہوں، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چند روز کے لیے پیرس میں ضرور ٹھہرے گا اور ہر شام دریائے سین کے کنارے پاسکل کو تلاش کرے گا، وہ انہی خیالوں میں غلطان تھا کہ اسے نیند نے آیا۔

رات کے پچھلے پھر ساتھ والے کمرے سے ایک دم تیز موسمیتی کی بھرپور آواز آئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ موسمیتی کے ساتھ کسی مرد کے قہقہوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ جانے یہ لڑکی اب تک سوئی کیوں نہیں؟ سنان نے سوچا۔ اس نے رضائی سے مر نکال کر باہر دیکھا تو اس کا چھوٹا سا کمرہ چاندنی میں نہیا ہوا تھا۔ وہ پھیلی شب سوٹے سے قبل کھڑکی بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے سفری رضائی اپنے گرد اچھی طرح

لپیٹ لی اور پنگ سے اٹھ کر کھڑکی میں آکرنا ہوا۔ اس کے سامنے پیرس کا حسین نم  
چاندنی میں نمایا ہوا تھا، مومارت کے قدیم مگر خوش نظر مکان اور ان سے پرے یکسر  
کر کے سفید گندبھی چاندنی میں چمک رہے تھے۔ ہر سو ایک سحر انگیز سکوت طاری  
جس میں صرف ساتھ والے کرے سے بجھنے والی تیز موسيقی تخل ہو رہی تھی۔ کچھ  
بعد تیز موسيقی ختم ہو گئی، ایک لمحہ کے لیے سکوت مکمل ہو گیا اور پھر آہستہ سے ہر  
کی اداس اور درد بھری تائیں فضا میں گوئیتے گئیں۔

یورپ میں آج کل جمال مشرقی عادات و اطوار کو اپنایا جا رہا ہے وہاں مشہذ  
موسيقی بالخصوص ستار بھی بیجد مقبول ہو رہی ہے۔ موسيقی کے رسیا لڑکے اور لوگوں  
کے پاس مشرقی موسيقی کے ریکارڈ ضرور ہوتے ہیں۔ اگرچہ ساتھ والے کرے میں بجھ  
والا ریکارڈ کسی تجھے ہوئے موسيقار کا نہ تھا تاہم وطن سے دور پیرس جیسے شریں اور  
چاندنی رات میں ستار کی دلاویز دھنوں نے سنان پر رقت طاری کر دی۔ تمام شب اس  
کے دل کے عینیں کونوں میں جو اداسی کوٹیں بدل رہی تھیں۔ ستار کی دلنشیں سروں  
لے اسے اور بھی گمرا کر دیا۔ دل میں ایک دریچہ کھلا اور ایک من موہنی صورت لے  
جائناکا۔ اور پھر اس سے پرے درتیچے کھلتے گئے اور ہر ایک میں سے پاسکل جھائکے  
گئی اس کی نیلی آنکھوں میں گھبیر اداسی تھی اور وہ سنان سے مخاطب تھی۔

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔ تم سے پہلے بھی اور لوگوں نے مجھے  
سے جھوٹے وعدے کیے۔ میں نے کہا تھا نا میں ہیشہ صرف رحم اور ہمدردی کے  
جنبدات کی بھکاری بن جاتی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں میرا سکول ان سے  
بمرپکا ہے مجھے محبت کی تلاش تھی جو مجھے کبھی نہ مل سکی۔ میں آج بھی دریائے سینا  
کے کنارے اکیلی گھومتی رہی۔ اکیلی۔ اکیلی۔“

پرس کا شمار یورپ کے قدم تین شہروں میں ہوتا ہے۔ ازمنہ قدم میں جب یہ علاقہ چند ولدوں اور جزویوں پر مشتمل تھا سیکٹ نسل کے لوگ یہاں آباد ہوئے۔ پرس کا اولین حوالہ جو نیس بیزر کی ایک کتاب میں ملتا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہاں پر پارسی ہائی قبیلہ آباد تھا جس کے نام پر بعد میں اس نو آباد قبیلے کو پرس کما جانے لگا۔ وحشی ہنوں کا سردار ایٹلا ۳۰۷ء میں اس شرپر حملہ آور ہوا۔ اس کے بعد شاریمان کا دور آیا جو خلیفہ ہارون الرشید کا ہم عصر تھا اور جو اندرس فتح کرنے کے شوق میں کوہ پیرانیز کے اس پار جا کر مسانوں کے ہاتھوں اپنی فوج کی گت بنوا کر مختداً مختداً والپس آ گیا۔ اس کے بعد کی تاریخ گذڑ ہو جاتی ہے۔ لوئی اور قلب نام کے درجنوں بادشاہ آئے جن کا سیریل نمبر ہیشہ ذہن سے اتر جاتا ہے آخر میں عظیم نپولین کا درود ہوا۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

ثانی دوسری صبح دیر تک سوتا رہا۔ اس کے ذہن میں آج کے لیے کوئی واضح پروگرام موجود نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام دن اس تاریخی شر کے گلی کوچوں میں بے مقصد گھومتے ہوئے گزار دے اور شام کو دریائے سین کے کنارے پاسکل کی ٹلاش کرے۔

پانی کے ٹل میں آج پانی بھی موجود تھا۔ میڈم ٹھی نے حسب وعدہ نیچے سے پانی کی منقطع پلاٹی بحال کر دی تھی۔ شیو بنا نے اور کپڑے بدلنے سے فارغ ہو کر سنان نے کیڑہ کندھے پر لٹکایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ساتھ دالے دروازے کے پاس رکا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ اور پھر بیڑھیوں سے نیچے اتر

گیا۔ ہال میں میدم ٹھی یا اس کی بوڑھی ماں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا البتہ وہ مجھے طوطا مزے سے پھرے میں بیٹھا آنکھیں جھپکا رہا تھا اور حسب سابق سنان کو دیکھنے میں نہیں کرنے لگا۔ سنان نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر چکے سے پھرے کا دروازہ کھول کر طوٹے کے سنبھے سر پر ایک دھپ لگادی طوٹے نے ایک لبی ٹھیں کی اور پھر خاموش ہو گیا۔ سنان اپنے اس کارناٹے پر بیجد مسحور ہوا اور ہاتھ ملہ ہوا مکان سے باہر نکل آیا۔

وہ خاصی دیر یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ ایک گلی میں اس کی نظر اس قوہ خانہ پر پڑی جماں اس کی ملاقات طوٹے والی بڑی اماں کے ساتھ ہوتی تھی۔

”آج شام یہاں آکر کافی پی جائے گی“ سنان نے اپنے آپ سے کہا اور آگے بڑھ گیا پاسکل سے نہ طلنے کا غم پیرس کی حسین اور چمکتی ہوئی صبح نے قدرے ماند کر دیا تھا اور وہ ایک تجربہ کار سیاح کی مانند ہرشے، ہر عمارت اور شر کے مکینوں کو بہ نظر غور دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ”شر کا یہ حصہ خاصاً پسمندہ و دکھائی دیتا ہے اکثر بالکنوں کی حالت مخدوش ہے۔ چند مکان گرنے کو ہیں۔ گلیاں کھردارے پھر کی ہیں (جانے)“ صوبیدار دلوخواز نے شیشے کی سڑکیں کہاں دیکھی تھیں؟) لوگ انگریزوں کی نسبت قدرے فربہ، چھوٹے قد کے اور سیاہ بالوں والے ہیں، اتنے صاف ستھرے بھی نہیں البتہ انگریزوں کے مقابلے میں زندگی سے بیزار و دکھائی نہیں دیتے بلکہ ضرورت سے زیادہ مسحور ہیں۔“ وہ یونہی تاکتا جھانکتا سیکرے کر کے کلیسا تک آگیا جس کے خوبصورت گنبد اس کے کمرے سے دکھائی دیتے تھے۔ وہ صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

کلیسا بیجد تاریک اور خنک تھا۔ سامنے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریمؑ کے درجنوں مجسموں کے نیچے سینکڑوں لامبی اور نازک مووم بیان جھملانا رہی تھیں۔ چند لوگ بن میں اکثریت بوڑھی عورتوں کی تھی لکڑی کے سخت بچوں پر گھنٹے لیکے عبادت میں معروف تھے۔ سنان کو خیال آیا کہ اگر اس عمارت میں روشنی کا انتظام قدرے بترے

جائے تو طرز تغیر کی باریکیاں اجاگر ہو سکتی تھیں۔ ننان بھی ستانے کی خاطر ایک بچے پر بیٹھ کر یونہی جلتی ہوئی موم بیلوں کو گھورتا رہا۔ اس سے کچھ دور سیاہ لباس میں لمبسوں ایک بوڑھی عورت عبادت کر رہی تھی عورت ننان کو دیکھ کر مسکرا دی۔ یہ طوٹے والی بڑی اماں تھیں۔ ننان کو خفت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس بڑی اماں کے چینیتے طوٹے کو چپٹ لگا کر آیا تھا۔ وہ جواباً مسکرا دیا اور پھر بچے سے اٹھ کر جلدی سے باہر آگیا۔ باہر کی تیز دھوپ نے اس کی آنکھیں چھدھیا دیں۔

کلسا کے عین سامنے چوڑی اور خوبصورت سیڑھیاں نیچے بازار تک اترتی تھیں ان سیڑھیوں پر بیدر رونق تھی۔ فرانسیسی بوڑھے جو پاپ منہ میں اڑ سے اخبار پڑھنے میں مگن تھے یا دھوپ میں اوگنے رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں، بے شمار ننھے منے بچے، کچھ پچھے گاڑیوں میں کلبلاتے ہوئے اور ان سے عمر میں بڑے سیڑھیوں کے ساتھ باپیچے میں "کیری کاڑا" قسم کا کوئی کھلیل کھیلتے ہوئے۔ بنان نے وہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی کمی بڑی طرح محسوس کی پھر اسے یاد آیا کہ پیرس کے باشندوں کی اکثریت موسم گرمائی میں ساحلی مقامات کی جانب کوچ کر جاتی ہے اور بقول ایک گائیڈ بک کے وہاں صرف نئے آوارہ گرو، فلاش مصور، غیر ملکی سیاح اور آوارہ کتے ہی رہ جاتے ہیں۔ یہاں پر کہتے تو نظر نہیں آرہے تھے البتہ مصوروں کی بہتات تھی جو ایزیل سامنے رکھے اردو گرو کے شور سے لاتعلق سیکرے کر کے خوبصورت گنبدوں کو کیوس پر منتقل کر رہے تھے۔ ننان بھی وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور پیرس کی زندگی کے ان دلچسپ پہلوؤں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

ابھی وہ وہاں کچھ دیر ہی بیٹھا ہو گا کہ ایک نوجوان مصور اس کے پاس آ کردا ہوا مصور کے گلے میں مختلف قسم کی درجنوں مالائیں تنسیکیں اور مندروں میں بجائی جانے والی ایک بڑی تھمنی لیک رہی تھی۔ مصور نے تھمنی اٹھا کر ننان کے کان کے پاس لے جا کر زور زور سے بجائی اور مسکرا نے لگا۔

"صحیح بخیر"

سنان بھی مسکرا دیا۔

تصور اس کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر برا جان ہو گیا اور بغل میں دابی ہوئی تھی۔ تصویروں میں سے ایک نکال کر سنان کے گھنٹوں پر پھیلا دی۔ سنان تصویر کو دیکھ کر بیجد حیران ہوا۔ یہ اس کی اپنی ہی لگ رہی تھی۔

”آپ نے شاید مجھے دیکھا نہیں۔ میں پچھلے دس منٹ سے آپ کی تصویر کشی میں مصروف تھا“ تصویر نے نہایت ادب سے کہا۔

”خوب ہے“ سنان نے کہا۔ تصویر واقعی عمدہ نہیں تھی۔

”میری طرف سے یہ بطور تخفہ قبول فرمائیے“ تصویر نے کھڑے ہو کر جھک کر اور گلے میں بندھی گھنٹی ہلا دی۔ ٹن ٹناش۔

سان ان اس بے جا خلوص کے مظاہرے سے بیجد متاثر ہوا۔

”نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہر حال آپ کا شکریہ۔“

”شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے مشرقی خدو خال اتنے ولغیرب ہیں کہ میرے اندر تخلیقی جذبات کا ایک سمندر اُبیں پڑا اور مجھے آپ کی تصویر بناتے ہی نہیں۔“

سان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ گویا وہ واقعی خوش شکل تھا۔

اس نے تصویر کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور تصویر قبول کر لی۔ اسے توہش سے ہی تخلیقی جذبات کی سرپرستی کا خیال رہتا تھا۔

”میں بیجد ممنون ہوں۔“ سنان اس کے احسان تسلی دبا جا رہا تھا۔

تصویر نے جواباً صرف گھنٹی بجا دینے پر اکتفا کیا۔ ٹن ٹناش اور وہیں کھڑا رہا۔ سنان کچھ عرصہ تو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا تا رہا مگر جب اس کے جڑے دکھ شروع ہو گئے تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ آخر یہ تصویر یہاں سے جاتا کیوں نہیں؟

”میں نے کہا کہ میں بیجد ممنون ہوں۔“ سنان نے ایک مرتبہ پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ تصویر نے بھی ایک مرتبہ پھر وہیں کھڑے کھڑے گلے میں بندھی گھنٹی ہا۔

دی شن شاٹن۔

سنان جھلا گیا۔ آخر یہ حضرت چاہتے کیا ہیں؟

اس نے اپنی تصویر سیڑھیوں پر رکھ دی اور جیب سے سگریوں کا پیکٹ نکالا۔ بہترن طریقہ میں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جائے خود بخود چلا جائے گا۔ سنان پیکٹ میں سگرٹ نکالنے لگا تو مصور نے جھک کر اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک سگرٹ اٹھا لیا۔ سنان خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ اپنا سگرٹ سلاکنے لگا تو مصور نے بھی منہ میں دابا ہوا سگرٹ آگے کر دیا۔ سنان کو طوعاً ”کہا“ سلاکنا پڑا۔ سگرٹ سلاکا کر مصور پھر سیدھا کھرا ہو گیا اور گلی میں لکھتی ہوئی تھنٹی بجا دی۔ شن شاٹن ”آخراب تم چاہتے کیا ہو؟“ سنان نے تھنگ آکر پوچھا۔

”میں فرانک“

”میں — وہ کس بات کے؟“

”تمن فرانک کا کیوس اور ایک فرانک کے رنگ تصویر کشی میں صرف ہوئے اور سولہ فرانک میری اجرت۔“

سنان میں تخلیقی جذبے کی سپرستی کے ارفع اعلیٰ جذبات فوراً سرد پڑ گئے۔

”شن شاٹن“ مصور نے پھر تھنٹی بجائی اور کہتا شروع کیا ”میں فرانک کچھ زیادہ نہیں۔“ ہو سکتا ہے آج سے چند سو برس بعد میں ایک بہت بڑے مصور کی حیثیت سے پہچان لیا جاؤں اور یہی تصویر آپ میں ہزار فرانک میں فروخت کر دیں۔“

”چند برسوں بعد میں فروخت کر سکوں۔۔۔؟“ سنان نے میں پر زور دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”جلستے آپ کی اولاد ہی سی۔ اب لایئے نا میں فرانک مجھے کسی اور سیاح کی تصویر بھی بنانی ہے۔“

سودا پندرہ میں طے ہو گیا اور سنان قیمت ادا کر کے فوراً ہی وہاں سے اٹھ کھرا ہوا مباراً کسی اور مصور کے دل میں اس کے مشقی خدوغمال دیکھ کر تخلیقی جذبات کا